۵۔ ملاحظہ کیجیے: محمد امین، ڈاکٹر، عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۹ئ، (طبع اول)، ص ۳

۶۔ صبحی محمصانی، ڈاکٹر۔ فلسفہ شریعتِ اسلام (مترجم مولوی محمد احمد رضا)، مطبوعہ مجلسِ ترقی ادب، لاہور، طبع ششم، جون ۱۹۸۱ئ، ص ۸۔۹

۷۔ سید ریاض الحسن گیلانی، سید، ڈاکٹر۔ The Reconstruction of Legal thought in Islam، ص ۱۷، مشمولہ: محمد امین، ڈاکٹر۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون (طبع اول)، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۷

۸۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون، ص ۷

۹۔ **مجلة الأحكام العدلية** (مترجم: عبدالقدوس ہاشمی)، مطبوعہ انٹرنیشنل پریس، میکلوڈ روڈ، کراچی، ۲۷ دسمبر، ۱۹۶۶ئ، دفعہ ۱۴، ص ۲۵

۱۰۔ مودودیؒ، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، مطبوعہ، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ئ، ص ۳۲۴

۱۱۔ ابن ابی شیبہ، المصنف، ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۴۰۲ئ، حدیث: ۲۸۵۳۰

۱۲۔ ابوداؤد، سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، کتاب القضائ، باب فی القاضی تخطی

۱۳۔ فلسفہ شریعتِ اسلام، ص ۲۲۸، ۲۲۹

۱۴۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، خطباتِ بہاول پور، مطبع، اسلامی یونیورسٹی بہاول پور، ۱۴۰۲ھ، ص ۷۱، ۷۲

۱۵۔ حوالہ سابق، ص ۷۲، ۷۴، ۷۵

۱۶۔ اسلامی ریاست، ص ۴۴۶۔۴۴۷

۱۷۔ فاروقی، محمد یوسف، ڈاکٹر۔ اجتہادِ مناہج و اسالیب، مطبوعہ، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۹ئ، ص ۴۱

۱۸۔ روزنامہ جنگ، راول پنڈی، ۲۰/اپریل، ۲۰۰۹ء

☆☆☆

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں ؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کردیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری، تحمل وبرداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں ؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت: -/۱۸۵ روپے

بحث ونظر

تکثیری معاشرہ کے لیے قرآنی ہدایات

ــــــــــــــــــــ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

شعبۂ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونی ورسٹی، کلکتہ اور اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اشتراک سے مورخہ ۱۳-۱۵/ مارچ ۲۰۱۵ء میں ایک سہ روزہ بین الاقوامی سمینار ’تکثیری معاشرہ، اسلام اور مسلمان‘ کے مرکزی موضوع پر منعقد ہوا تھا۔ اس کے لیے راقم نے یہ مقالہ تحریر کیا تھا، لیکن بعض ناگزیر وجوہ سے اس سمینار میں شرکت نہیں ہوسکی۔ اس موضوع کے بعض پہلوؤں پر راقم کی کتاب ’حقائقِ اسلام۔ اعتراضات کا جائزہ‘ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی قابل قدر کتاب ’غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق‘ اس موضوع پر بھرپور اور جامع مطالعہ ہے۔ موصوف کی دوسری کتاب ’غیر اسلامی ریاست اور مسلمان‘ میں بھی دور حاضر کے پس منظر میں اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (رضی الاسلام)

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کے درمیان گوناگوں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ رنگ، نسل، زبان، علاقہ، تہذیب و تمدن، معاشرت، عقیدہ، مذہب، کسی معاملے میں وہ یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان سب پہلوؤں سے ان میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ان اختلافات کو نظر انداز کرنے، انھیں گوارا کرنے اور ان کے باوجود مل جل کر رہنے اور پُر امن طریقے سے زندگی گزارنے کو موجودہ دور کی ایک اہم قدر قرار دیا جارہا ہے۔ اس

کے لیے ایک اصطلاح PLURALISM کی وضع کی گئی ہے۔اردو میں اس کا ترجمہ 'کثرتیت' یا 'تکثیریت' کیا جاتا ہے۔

ریفرنس آکسفورڈ ڈکشنری میں PLURALISM کا یہ مفہوم بیان کیا گیا ہے:

The existence or toleration in society of a number of groups that belong to different races or have different political or religious beliefs.

"تکثیریت سے مراد ہے کسی سماج میں ایسے متعدد گروہوں کی موجودگی اوران کے درمیان رواداری، جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہوں، یا مختلف سیاسی تصورات یا مذہبی عقائد کے حامل ہوں۔"

برٹانیکا ریفرنس انسائیکلو پیڈیا میں اس کی یہ تشریح کی گئی ہے:

Pluralism assumes that diversity is beneficial to society and that the disparate functional or cultural groups of which society is composed -- including religious, trade unions, professional organisations and ethnic minorities -- should be autonomous.

"تکثیریت کا مفروضہ یہ ہے کہ تنوع سماج کے لیے مفید ہے۔ چنانچہ سماج کے مختلف طبقات یا تہذیبی اکائیوں کو۔۔جن میں مذہبی گروہ، ٹریڈ یونینیں، پیشہ ورانہ انجمنیں اور نسلی اقلیتیں شامل ہیں۔۔حقِ خوداختیاری حاصل ہونا چاہیے۔"

قرآن کریم پر اعتراضات کی حقیقت

قرآن کریم پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک بڑا اعتراض

یہ ہے کہ وہ علیٰحدگی پسند ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو انفرادیت پسندی سکھاتا ہے اور انہیں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہے۔ حسنِ سلوک، ہمدردی، مساوات، ربطِ باہم، تعاون و امداد اور خوش گوار انسانی تعلقات کے سلسلے میں اس نے جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں، وہ صرف مسلمانوں کے لیے ہیں۔ رہے دوسرے مذاہب کے ماننے والے تو ان کے لیے اس کے پاس نفرت وحقارت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ وہ کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں، ان کے ساتھ کسی طرح کی ہمدردی اور خیر خواہی نہ کریں، بلکہ انہیں تنگ کرنے، نیچا دکھانے اور تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔اس طرح یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تکثیری معاشرہ کے لیے اسلام موزوں نہیں ہے۔ آج جب کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن گئی ہے، مختلف قوموں، گروہوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان تعامل ناگزیر ہے، ایسے میں قرآن کی معاشرتی تعلیمات فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتوں میں مسلمانوں کو دوسرے دھرموں کے پیروکاروں سے لڑنے جھگڑنے اور جنگ و جدال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب تک ان آیتوں کو قرآن سے نکالا نہیں جاتا، دیش کے دنگوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ انہی الزامات کے تحت کچھ عرصہ قبل کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا اور قرآن پر پابندی عائد کروانے کی کوشش کی گئی تھی، مگر فاضل ججوں نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خارج کر دیا۔

قرآنی تعلیمات کے بارے میں یہ تاثر درست نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے اصولی طور پر مسلم اور کافر کے درمیان فرق کیا ہے، لیکن اس فرق کا کچھ بھی اثر انسانی حقوق اور معاشرتی تعلقات پر نہیں پڑتا۔ اس نے انسان کے جو بنیادی حقوق متعین کیے ہیں، ان سے ہر شخص بہرہ ور ہوگا، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر۔ مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لیے قرآن نے جو ہدایات اور تعلیمات دی ہیں، ان کا اطلاق معاشرہ کے تمام افراد پر ہوگا،

خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر۔ ایک ایسا معاشرہ، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے بستے ہوں، اس کے افراد کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں قرآن نے واضح ہدایات اور احکام دیے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ تعلقات بغض و عداوت، نفرت و حقارت، کشیدگی اور بدگمانی پر مبنی نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی بنیاد حسن سلوک، ہمدردی، تعاونِ باہمی، نصح و خیر وخواہی اور حسن ظن پر قائم ہوگی۔

والدین اور رشتہ داروں سے تعلقات

معاشرہ میں انسان کا سب سے قریبی تعلق والدین اور رشتہ داروں سے ہوتا ہے۔ قرآن ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے اور اس معاملے میں مسلم اور کافر کی کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص نے اسلام کو دین حق سمجھ کر قبول کیا ہو، لیکن اس کے والدین اس سعادت سے محروم ہوں، تو بھی مذاہب کا یہ اختلاف اسے ان کی خدمت کرنے، ان کی خبر رکھنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ یہی نہیں، بلکہ اگر اس کے والدین اس کے اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں اس سے ناراض ہوجائیں، اس پر طرح طرح سے دباؤ ڈالیں کہ وہ اسلام سے پھر جائے اور اسے اذیتیں دیں، تو ایسی صورت میں یہ عمومی ہدایت ہے کہ وہ دین حق سے دست بردار تو نہ ہو، البتہ ردعمل کے طور پر طیش میں آ کر اپنے والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک ترک نہ کردے، بلکہ اس معاملے میں ادنیٰ سی بھی کوتاہی نہ کرے۔ چناں چہ قرآن کا واضح حکم ہے:

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا (لقمان: ۱۵)	اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان، البتہ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔

یہ آیت مکی دور کے اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب آں حضرت ﷺ کی دعوت پر قریش کے نوجوان لبیک کہہ رہے تھے اور حلقہ بہ گوش اسلام ہو رہے تھے۔

دوسری طرف ان کے والدین، رشتہ دار اور خاندان کے لوگ انہیں اس سے روکنے اور اسلام سے پھیر کر آبائی مذہب کی طرف واپس لانے کے لیے ہر جتن کر رہے تھے اور اس میں ناکامی کی صورت میں انہیں جسمانی اذیتیں دے رہے تھے۔ ممکن تھا کہ ان حالات میں وہ نوجوان بھی ردعمل کی کیفیت کا شکار ہوجاتے اور والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ان میں انتقامی جذبہ پیدا ہوجاتا، یا کم از کم ان سے وہ بے پروا ہوجاتے، لیکن انہیں تاکید کی گئی کہ وہ ناحق میں تو ان کی بات نہ مانیں، لیکن دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ بھلے طریقے سے پیش آئیں اور اچھا سلوک کرتے رہیں۔

والدین کے بعد رشتہ داروں کا درجہ ہے۔ وہ بھی اسی طرح حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ قرآن تاکید کرتا ہے کہ رشتہ دار خواہ ہم مذہب ہوں یا دوسرے مذہب کے ماننے والے، ان کے حقوق ادا کیے جائیں اور ان کی خبر گیری میں کوتاہی نہ کی جائے۔ اس معاملے میں قرآن کتنا حساس ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی شریعت میں کسی شخص کے مستحقِ میراث ہونے کے لیے مسلمان ہونے کی شرط لگائی گئی ہے۔ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی دوسرے ذریعے سے بھی اسے کسی طرح کا مالی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کو وصیت یا تحفے تحائف کے ذریعے اپنے مال کا کچھ حصہ دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأُوْلُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَن تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُم مَّعْرُوفاً (الاحزاب:٦)

کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ اس لیے اپنے اولیاء (دیگر متعلقین) کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق عام لوگوں پر مقدم ہیں۔ سورۂ احزاب ۵ھ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے، ہجرتِ مدینہ کے بعد اللہ کے رسول ﷺ

نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا۔اس تعلق کی بنا پر مہاجرین اور انصار ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ آیتِ بالا کے نزول کے بعد یہ طریقہ موقوف ہوگیا اور وراثت کی بنیاد رشتہ داری کو قرار دیا گیا۔آیت کے آخری ٹکڑے إِلَّآ أَن تَفۡعَلُوٓاْ إِلَىٰٓ أَوۡلِيَآئِكُم مَّعۡرُوفٗاۚ کا مطلب یہ ہے کہ (میراث کے مستحق) رشتہ داروں کے علاوہ اپنے دوسرے متعلقین کی مالی مدد کرنا چاہو تو دیگر کسی ذریعہ (مثلاً تحفے یا وصیت وغیرہ) سے ایسا کر سکتے ہو۔

محمد بن الحنفیہؒ فرماتے ہیں:

''اس آیت کے ذریعہ غیر مسلم کے لیے وصیت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔یعنی اپنے کافر رشتہ دار کے ساتھ ایسا کیا جاسکتا ہے۔مشرک رشتہ دار سے اگرچہ دین کا تعلق نہیں ہے، لیکن نسبی اعتبار سے وہ رشتہ دار ہے، اس لیے اس کے حق میں وصیت کی جاسکتی ہے۔''[۱]

قتادہؒ، حسنؒ اور عطاؒ فرماتے ہیں:

''اس آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ مسلمان اپنے کافر رشتہ دار کو اپنی زندگی میں جو چاہے، دے سکتا ہے اور مرتے وقت اس کے لیے وصیت کرسکتا ہے۔''[۲]

پڑوسیوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات

رشتہ داروں کے بعد انسان کا سب سے قریبی تعلق اپنے پڑوسیوں سے ہوتا ہے۔ان کا ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ پڑوسی اچھے ہوں تو انسان اپنے اہل وعیال، گھر اور مال سے بے فکر ہوکر کاروبارِ زندگی میں مصروف ہوتا ہے۔ان کی طرف سے اطمینان نہ ہوتو اسے کبھی ذہنی یکسوئی نہیں مل سکتی۔قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان ایک اچھا پڑوسی بنے، اس کی ذات سے اس کے پڑوسیوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، وہ ان کے دکھ درد میں کام آئے اور ان کے ساتھ خوش گوار تعلقات رکھے۔قرآن کریم میں ہے:

وَبِالْوَالِدَیْنِ إِحْسَاناً وَبِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ الْجَارِ ذِیْ الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالجَنبِ (النسائ:۳۶)

ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہم سایہ سے، پہلو کے ساتھی سے ......احسان کا معاملہ رکھو۔

اس آیت میں تین طرح کے پڑوسیوں کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم دیا گیا ہے: ایک الْجَارِ ذِیْ الْقُرْبٰی (رشتہ دار پڑوسی) دوسرا الْجَارِ الْجُنُب (اجنبی پڑوسی) اور تیسرا الصَّاحِبِ بِالجَنبِ (پہلو کا ساتھی، جس سے تھوڑی دیر کا ساتھ ہوجائے)۔ بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ الْجَارِ ذِیْ الْقُرْبٰی سے مراد مسلم پڑوسی اور الْجَارِ الْجُنُب سے مراد غیر مسلم پڑوسی ہے۔ ۳؎

احادیث میں بھی پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی بہت تاکید آئی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیحسن الی جارہ ۴؎

جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اسے اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ایک موقع پر صحابۂ کرام کی ایک مجلس میں تین مرتبہ ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم، وہ شخص مومن نہیں ہے۔'' صحابہ نے دریافت کیا: ''کون؟ اے اللہ کے رسول! فرمایا:

الذی لا یأمن جارہ بوائقہ ۵؎

وہ شخص جس کا پڑوسی اس کے شر و فساد سے محفوظ نہ ہو۔

مذکورہ بالا آیت اور احادیث عام ہیں۔ ان میں مسلمان ہونے کی قید نہیں ہے۔ غیر مسلم پڑوسی بھی ان میں شامل ہیں۔ اسی لیے صحابۂ کرام اپنے غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے تھے۔ حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن

عمروؓ کے پاس تھا۔ ان کے ملازم نے ایک بکری ذبح کی تو انہوں نے فرمایا: ''اس کا گوشت تقسیم کرو تو سب سے پہلے ہمارے یہودی پڑوسی کے یہاں بھیجو۔'' ایک شخص نے کہا: ''کیا آپ اس یہودی کے یہاں بھیجیں گے؟ فرمایا: ''میں نے نبی ﷺ کو پڑوسی کے بارے میں اتنی تاکید کرتے ہوئے سنا ہے کہ ہمیں اندیشہ ہونے لگا کہ آپ اسے وراثت میں حق دار قرار دے دیں گے۔''۶؎

حسنِ معاشرت

جب کچھ لوگ ایک جگہ رہتے بستے ہیں تو ان کے درمیان سماجی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں۔ باہم خوش گوار تعلقات کے لیے ضروری ہے کہ تمام افراد ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ اپنے پڑوسیوں، ملاقاتیوں اور شرکاءِ کار کے ساتھ الفت و محبت سے پیش آئیں، ان کی خوشیوں میں شریک ہوں، ان کے غم کو اپنا غم سمجھیں اور ان کی ہمدردی، مواسات، دل جوئی اور غم خواری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ قرآن انسانی جذبات کا پورا لحاظ کرتا ہے۔ وہ غیر مسلموں سے انسانی روابط رکھنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ ان کی تاکید کرتا ہے:

لاَ یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوکُم مِّن دِیَارِکُمْ أَن تَبَرُّوھُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَیْھِمْ إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (الممتحنۃ:۸)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تکثیری معاشرہ میں رہنے والے دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے تعلقات کے سلسلے میں یہ آیت بہت اہم ہے۔ اس میں دو جملے آئے ہیں: أَنْ تَبَرُّوْھُمْ اور تُقْسِطُوْا إِلَیْھِمْ۔ برّ سے مراد ہے حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنا۔ اس میں زیادہ سے

زیادہ حسن سلوک کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے (**البرّ: التوسّع فی الاحسان الیہ**) ۸؎ **تُقْسِطُوْٓا اِلَیْہِمْ** کے معنیٰ بعض مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرو، جب کہ بعض دیگر مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ صلہ رحمی کے طور پر اپنے مال کا کچھ حصہ انھیں دو (**أن تعطوھم قسطاً من أموالکم علی وجہ الصلۃ**)۔۹؎

بعض مفسرین اس آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں، لیکن اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ آیت محکم یعنی غیر منسوخ ہے (**وقال أکثر أھل التأویل: ھی محکمۃ**)۔۱۰؎

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے:

ھذہ الآیۃ رخصۃ من اللہ تعالیٰ فی صلۃ الذین لم یعادوا المؤمنین ولم یقاتلوھم۔۱۱؎

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اجازت دی ہے جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں کی اور ان سے جنگ نہیں کی۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

قال أھل التأویل: ھذہ الآیۃ تدلّ علی جواز البرّ بین المشرکین و المسلمین، وان کانت الموالاۃ منقطعۃ۔۱۲؎

مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان نیکی اور حسن سلوک کا معاملہ جائز ہے، اگرچہ ان کے درمیان موالات (یعنی قریبی تعلق رکھنا) ممنوع ہے۔

غریبوں کا مالی تعاون

سماج میں کچھ لوگ غریب، محتاج، بے کس اور لاچار ہوتے ہیں۔ صاحبِ حیثیت اور مال دار لوگوں کا فرض ہے کہ ان کی خبر گیری کریں، وقتِ ضرورت ان کے کام آئیں اور ان کا سہارا بنیں۔ قرآن اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق

روا نہیں رکھتا۔ وہ غیر مسلموں پر بھی انفاق کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ساتھ ہی وہ یہ بھی صراحت سے کہتا ہے کہ غیر مسلموں پر محض اللہ کی خوش نودی کے لیے خرچ کیا جائے، ان سے کسی دنیوی منفعت کی امید نہ رکھی جائے اور انہیں مال کے ذریعے اسلام قبول کرنے کا لالچ نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ [1]

(البقرۃ:۲۷۲)

اے نبی! لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے، بخشتا ہے۔ اور راہِ خیر میں جو مال تم لوگ خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم راہِ خیر میں خرچ کروگے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

یہ آیت انفاق کے سیاق میں وارد ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کی آیات میں اہلِ ایمان سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے، اس سے کھلے چھپے ہر طرح سے، اس کے ضرورت مند بندوں پر خرچ کرو اور شیطان کے پیدا کردہ فقر و فاقہ کے اندیشوں میں مت مبتلا ہو اور اللہ کی راہ میں اپنا اچھا مال خرچ کرو، اس کے لیے خراب مال چھانٹ کر مت رکھو۔ اسی سیاق میں کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ خرچ کرو، اس میں اللہ کی خوش نودی اپنے پیش نظر رکھو۔ اس کا فائدہ تمہاری ذات کو پہنچے گا اور تمہیں بھرپور بدلہ دیا جائے گا۔ جو لوگ تمہاری مدد کے مستحق ہیں، ان کا ہدایت یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ مت سوچو کہ ان لوگوں پر اس وقت خرچ کریں گے، جب وہ اسلام لے آئیں گے۔ انہیں ہدایت پر لانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ جس کو چاہے گا، ہدایت سے نوازے گا۔ تمہارا کام یہ ہے کہ وہ خواہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں، اگر وہ ضرورت مند ہیں اور اللہ نے تمہیں نواز رکھا ہے تو ان کی ضرورت پوری کرو۔ روایات

میں آتا ہے کہ ابتدا میں صحابۂ کرام اپنے ان رشتہ داروں پر، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، خرچ نہیں کرتے تھے، بعض صحابہ نے اس سلسلے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ جو لوگ ہمارے ہم مذہب نہیں ہیں، کیا ان کا کچھ مالی تعاون کیا جا سکتا ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ۱۳؎

اعزاز واکرام

خوش گوار معاشرت کے لیے ضروری ہے کہ سماج کے تمام افراد کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے، ان کے ساتھ اعزاز واکرام سے پیش آیا جائے اور انہیں اچھے انداز سے مخاطب کیا جائے۔ اس معاملے میں بھی قرآن نے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا (النساء:۸۶)

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اسی طرح۔

حضرت ابن عباسؓ نے ایک موقع پر فرمایا: ''سلام کا جواب دو، خواہ سلام کرنے والا یہودی ہو یا عیسائی یا مجوسی۔'' اس کے بعد انھوں نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ ۱۴؎

احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو سلام کیا جا سکتا ہے، ان کے سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے، اور ان سے مصافحہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ایسی مجلس سے گزر ہوا، جہاں مسلمانوں کے علاوہ یہود اور مشرکین بھی تھے۔ آپؐ وہاں پہنچے تو آپؐ نے سلام کیا۔ ۱۵؎

صحابۂ کرام کا بھی معمول تھا کہ جس سے بھی ان کی ملاقات ہوتی، اسے سلام کرتے تھے اور اس معاملے میں کسی سے کوئی تفریق روا نہ رکھتے تھے۔ وہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ حضرت ابو امامہؓ کی راستہ چلتے ہوئے کسی سے ملاقات ہوتی تو اسے سلام کرتے، خواہ ملنے والا مسلمان ہو یا کوئی اور، چھوٹا ہو یا بڑا۔ ان سے

اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں سلام عام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔۱۶؎ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں بھی روایات میں آتا ہے کہ وہ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے، خواہ ملنے والا مسلمان ہو یا غیر مسلم۔۱۷؎

معاملات

معاشرہ کے افراد کو قدم قدم پر ایک دوسرے کے تعاون، مدد اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور انہیں باہم مختلف معاملات کرنے پڑتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ان کے لیے زندگی گزارنا دشوار ہو جائے۔ جس سماج میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں، وہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں اور ایک دوسرے سے معاملات کر سکتے ہیں۔ قرآن اس معاملے میں مذاہب کے اختلاف کو رکاوٹ نہیں بناتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے ماننے والے غیر مسلموں کے اشتراک سے کاروبار کر سکتے ہیں، ان سے رہن، مزارعت وغیرہ کے معاملات کر سکتے ہیں، بغیر کسی کراہت کے ان کی مصنوعات استعمال کر سکتے ہیں اور انہیں اپنی چیزیں فروخت کر سکتے ہیں، ان کے یہاں اجرت پر کام کر سکتے ہیں اور انہیں اپنے یہاں کام پر لگا سکتے ہیں۔ غرض ہر طرح کے تجارتی و کاروباری معاملات غیر مسلموں کے ساتھ کیے جا سکتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف سے اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سلسلے میں قرآن کی اصولی تعلیم یہ ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْد (المائدۃ:۱)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! معاہدوں کی پابندی کرو۔

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام غیر مسلموں سے ہر طرح کے معاملات کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری دنوں میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن رکھ کر اس سے اپنے گھر والوں کی ضروریات کے لیے کچھ غلہ لیا تھا۔۱۸؎ حضرت عبد الرحمن بن ابی بکرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مشرک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ بکریاں لے کر

آیا۔آپؐ نے اس سے ایک بکری خریدی۔ ۱۹؎ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح خیبر کے بعد وہاں کی زمین یہود کے پاس رہنے دی، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان میں کاشت کریں گے اور انہیں پیداوار کا نصف ملے گا۔ ۲۰؎ سفرِ ہجرت کے موقع پر ایک غیر مسلم کی خدمات حاصل کی گئیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے اس کی رہ نمائی میں مدینہ کا سفر کیا تھا۔ ۲۱؎ حضرت خبابؓ اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ میں لوہار تھا۔ میں نے مکہ میں عاص بن وائل (مشہور مشرک) کا کچھ کام کیا تھا۔ ۲۲؎

امام نوویؒ ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہل ذمہ اور دیگر کفار سے معاملات کیے جاسکتے ہیں بشرطے کہ ان معاملات میں کوئی حرام چیز شامل نہ ہو۔'' ۲۳؎

رواداری

تکثیریت کا بنیادی عنصر رواداری ہے۔یعنی اپنے عقیدہ و مذہب کو حق سمجھتے ہوئے اس سے اختلاف رکھنے والوں کی یہ آزادی تسلیم کرنا کہ وہ جو عقیدہ و مذہب چاہیں اختیار کرسکیں۔قرآن اس کا علم بردار ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ:۲۵۶)	دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ بے شک ہدایت گم راہی سے ممتاز ہوگئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا تو اس میں ہے کہ تمام انسان سیدھے راستے پر چلیں اور اس کی معصیت سے بچیں،لیکن اس کی مشیت یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی سے اپنے لیے عقیدہ و مذہب کا انتخاب کریں۔ چنانچہ اس نے بہ جبر تمام انسانوں کو مسلمان نہیں بنایا ہے اور اپنے پیغمبر کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملے میں جبر سے کام نہ لیں۔قرآن میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے:

وَلَوْ شَاء رَبُّکَ لآمَنَ مَن فِیْ الأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّی یَكُونُوا مُؤْمِنِیْن (یونس:۹۹)

اگر تیرے رب کی مشیّت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہوجائیں؟

قرآن میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سامنے حق واضح کردیا ہے، ساتھ ہی انھیں ارادہ و اختیار کی آزادی بخشی ہے کہ وہ چاہیں تو اسے قبول کرکے دائرۂ اسلام میں آجائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر قائم رہیں:

إِنَّا هَدَیْنَاهُ السَّبِیْلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً۔ (الدھر:۳)

ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاء فَلْیُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْیَكْفُرْ۔ (الکہف:۲۹)

صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔

دوسرے مذاہب کی محترم شخصیتوں کا احترام

قرآن اہلِ مذاہب سے مکالمہ کا قائل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ حق واضح کیا جائے اور باطل کی تردید کی جائے اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے اپنی مذہبی تعلیمات میں جو غلط باتیں شامل کرلی ہیں انھیں چھانٹ کر الگ کردیا جائے، لیکن وہ تاکید کرتا ہے کہ مذاکرہ و مباحثہ میں سنجیدگی، متانت اور شائستگی ملحوظ رکھی جائے اور ایسا لہجہ نہ اختیار کیا جائے کہ ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوں۔ اس سیاق میں اس نے ان شخصیتوں کے بارے میں، جن سے وہ عقیدت رکھتے ہیں، نازیبا کلمات منہ سے نکالنے سے منع کیا ہے۔ اس کی سخت تاکید ہے:

وَلاَ تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْواً بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۸)

اور (اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ سبحانہ نے اس آیت میں بتوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے کہ اگر انھیں برا بھلا کہا جائے گا تو ان کی پوجا کرنے والوں کی نفرت اور کفر میں اضافہ ہوگا۔ علماء کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم اس امت کے لیے ہر زمانے میں باقی ہے۔''۲۴؎

امام رازیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کفار کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ اس کے جواب میں وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں نازیبا کلمات کہنے لگیں۔ اس سے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اگر تمھارا مخالف جہل اور نادانی کا مظاہرہ کرے تو تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم بھی اسی طرح کی باتیں کرنے لگو۔ اس لیے کہ اس طرح باہم جھگڑے اور گالم گلوج کی نوبت آسکتی ہے اور یہ عقل مندوں کا شیوہ نہیں ہے۔''۲۵؎

غیر مسلموں سے 'دوستی' کی ممانعت کا صحیح مفہوم

قرآن پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ 'دوستانہ تعلقات' رکھنے سے منع کیا ہے اور انھیں 'دشمن' کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمنوں کے بارے میں بغض و نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں، ان سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا جاتا، بلکہ انھیں نقصان پہنچانے کی تدبیریں کی جاتی

ہیں۔ اس اعتراض پر بہ طور دلیل اس طرح کی آیات پیش کی جاتی ہیں:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔ (النساء: ۱۴۴)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔

ایسی آیات پر ان کے صحیح تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کو 'اولیاء' نہ بنائیں۔ اولیاء ولی کی جمع ہے۔ اس کا مادہ 'ول ی' اور مصدر 'ولاء' ہے۔ ولاء کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد چیزیں اس طرح یکجا ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ان سے مغایر ہو۔ اسی سے استعارۃً یہ لفظ قربت کے معنی میں استعمال ہونے لگا، خواہ یہ قربت جگہ کی ہو یا تعلق کی یا مذہب کی یا دوستی، مدد اور عقیدہ کی۔ جس شخص سے مذکورہ نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا تعلق ہو، اس کے لیے 'ولی' اور 'مولیٰ' دونوں الفاظ مستعمل ہیں۔۲۶؎ ایسی آیتوں میں لفظ 'اولیاء' انتہائی قربت کے معنیٰ میں آیا ہے۔ علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں:

(لاتتّخذوھم أولیاء) تنصرونھم وتستنصرونھم وتؤاخونھم و تصافونھم وتعاشرونھم معاشرۃ المؤمنین۔۲۷؎	اللہ تعالیٰ کے ارشاد 'کافروں کو اولیاء نہ بناؤ' کا مطلب یہ ہے کہ ان سے تمھارا معاملہ ایسا نہ ہو کہ تم ان کی مدد کرو، ان سے مدد چاہو، ان سے بھائی چارہ اور خلوص و محبت کے تعلقات رکھو اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہو جس طرح اہل ایمان باہم رہتے ہیں۔

ان حالات کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جن میں مسلمانوں کو 'کافروں' سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا تھا۔ مسلمان سخت حالات سے گزر رہے تھے۔ ان کے خلاف ان کے دشمنوں نے جنگ برپا کر رکھی تھی اور انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھے۔ یہود و نصاریٰ کا رویّہ بھی کھلی دشمنی پر مبنی تھا۔ وہ مسلمانوں کے

خلاف کافروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک تیسرا گروہ منافقین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ظاہر میں اسلام کا دم بھرتے تھے اور انھوں نے خود کو مسلمانوں میں شامل کر رکھا تھا، لیکن حقیقت میں وہ کافروں سے ملے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو کوئی کامیابی ملتی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے اور انھیں کچھ نقصان پہنچتا تو خوشیاں مناتے تھے۔ یہ سارے لوگ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متحد تھے۔ ایسے حالات میں اپنے دشمنوں سے قریبی تعلق رکھنا مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ یہ چیز دینی حیثیت سے بھی ضرر رساں تھی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اسی لیے قرآن نے الگ الگ ہر گروہ کے بارے میں وضاحت سے مسلمانوں کو تاکید کی کہ ان سے 'ولایت' کا تعلق نہ رکھیں۔ (ملاحظہ کیجیے آیات: النسائ: ۱۴۴، المائدۃ: ۵۱، النسائ: ۸۹) اس معاملہ میں قرآن نے اس حد تک تاکید کی کہ جن لوگوں کے باپ اور بھائی دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور انھوں نے ایمان پر کفر کو ترجیح دی ہے، ان سے بھی قربت کا ویسا تعلق نہ رکھا جائے، جیسا کہ اہل ایمان کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مبادا ان کے واسطے سے ان کے اسرار کفار تک نہ پہنچ جائیں (التوبۃ: ۲۳)

قرآن کریم کی بعض آیات میں ان اسباب کی وضاحت کردی گئی ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کے علاوہ دوسروں سے انتہائی قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الَّذِيْنَ اتَّخَذُواْ دِيْنَكُمْ هُزُواً وَلَعِباً مِّنَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَآءَ۔ (المائدۃ: ۵۷)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے پیش رو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انھیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔

سورۂ ممتحنہ میں ہے:

يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ۔ (آیت ۱)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

اسی سورت میں آگے ہے:

إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ۔ (آیت ۹)

وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کو وہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں۔ دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ اللہ کے اور تمھارے دشمن ہیں اور تیسری آیت میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ محض دین کی وجہ سے تم سے جنگ کر رہے ہیں، تمھیں تمھارے وطن سے نکالا ہے یا اس میں مدد کی ہے۔ یہ اسباب بجا طور پر اس بات کے متقاضی تھے کہ ان سے قریبی تعلق نہ رکھا جائے۔

یہی مضمون ایک دوسری آیت میں یوں مذکور ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لاَ يَأْلُونَكُمْ خَبَالاً وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ أَكْبَرُ۔ (آل عمران: ۱۱۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے۔ تمھیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔

اس آیت میں لفظ 'بطانة' کے استعمال میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ بطانة کپڑے کے اندرونی حصے کو کہتے ہیں، جو جسم سے متصل ہوتا ہے۔ بہ طور استعارہ

اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جسے آدمی اپنا گہرا دوست اور ہم دم و ہم راز بنا لے۔۲۸؎ اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں سے اتنا قریبی تعلق استوار نہ کرلو کہ ان پر اپنے راز منکشف کردو۔ اس لیے کہ وہ لوگ تمھارے بہی خواہ نہیں ہیں، تمھیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور تم سے دشمنی اور نفرت ان کے رویّے سے عیاں ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ غیر مسلموں سے صرف ایسے قریبی تعلق سے منع کیا گیا ہے جس سے اسلامی ریاست کے سیاسی وعسکری راز دشمنوں پر منکشف ہوجائیں اور مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہوجائے اور یہ ممانعت صرف ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برسر جنگ ہوں یا ان کے دشمنوں کے مددگار بنے ہوئے ہوں۔ جہاں تک عام انسانی اور سماجی تعلقات رکھنے کی بات ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

الاحسان والهبة مستثناة من الولاية۲۹؎	غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور انھیں کچھ دینا 'ولایت' میں شامل نہیں ہے۔

مخالفوں سے لڑنے اور انھیں قتل کرنے کے احکام کا پس منظر

قرآن پر ایک بڑا، بلکہ شاید سب سے بڑا اعتراض اس کے تصور جہاد پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے جنگ کریں، ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیں، ان کے لیے گھات لگائیں اور انھیں جہاں پائیں قتل کریں۔ بہ طور دلیل یہ آیات پیش کی جاتی ہیں:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيكُمْ غِلْظَةً۔ (التوبۃ:۱۲۳)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جنگ کرو ان کافروں سے جو تمھارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں۔
فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ۔ (التوبۃ:۵)	---تو مشرکوں کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔

اس طرح کی آیات پیش کرکے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جب تک یہ آیات ہیں اس وقت تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بقائے باہم ممکن نہیں۔

یہ غلط فہمی درحقیقت جنگ کے بارے میں قرآن کے احکام و تعلیمات کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے اور متعلقہ آیات کو ان کے سیاق و سباق سے ہٹا کر پڑھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس موضوع پر متعدد پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

(الف) جب مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا جانے لگا تب انھیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا جواب دے سکتے ہیں:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ۔ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ (الحج:۳۹۔۴۰)

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: ہمارا رب اللہ ہے۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جنگ کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ جنگ ان پر تھوپی گئی تھی۔ دشمنوں کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو، جو ابھی کم زور ہیں، ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیں اور شمعِ اسلام کو اپنی پھونکوں سے گل کردیں۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان کا منہ توڑ جواب دیں اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں، لیکن اس وقت بھی انھیں تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ جتنی زیادتی کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لیں، حد سے تجاوز نہ کریں:

وَقَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (البقرة:۱۹۰)

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(ب) قرآن کریم میں مذکور آیاتِ قتال کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے،

بلکہ ان میں دورانِ جنگ کے سلسلے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ جب کسی گروہ سے جنگ بر پا ہوتو میدانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ کوئی رؤرعایت نہیں برتتا، بلکہ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مخالف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے اور اس کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل کر کے اس کی فوجی طاقت پارہ پارہ کردے۔ اس موقع پر کسی کم زوری اور نرمی کا مظاہرہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مثل ہے۔

(ج) جنگ ایک ناپسندیدہ، لیکن ناگزیر صورت حال ہے۔ اسی لیے مختلف مذاہب میں اس کے بارے میں احکام پائے جاتے ہیں۔ جن مذاہب میں جنگ سے متعلق کسی طرح کی تعلیم نہیں ملتی، ان کے پیروؤں کو بھی مختلف مواقع پر جنگ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ مذہبی کتابوں میں جنگ سے متعلق احکام وقوانین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا تعلق دشمن قوم کے ساتھ عام برتاؤ سے ہے، بلکہ ظاہر ہے کہ ان میں جنگ کی مخصوص صورت حال کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں ہندومت کی مذہبی کتابوں کے چند حوالے دیے جاتے ہیں:

> ''اے اِندر، ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ، جو مالِ غنیمت حاصل کرتی ہے۔ تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں، چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم ہر دشمن پر فتح مند ہوں۔ اے بہادر، ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوش حال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ''۔ ۳۰؎

> ''اے اگنی، ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، ہمارے دشمنوں کو بھگادے۔ اے اجیت، دیوتاؤں کو نہ ماننے والے حریفوں کو قتل کر اور اپنے پجاری کو عظمت وشوکت نصیب کر''۔ ۳۱؎

> ''اے مینو، طاقت ور سے زیادہ طاقت ور ہو کر ادھر آ اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کردے، دشمنوں اور ورتیروں اور دسیوں کو قتل

کرنے والے۔تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا''۔۳۲؎

بھاگوت گیتا کا تو موضوع ہی جنگ ہے۔ یہ دراصل کرشن جی کے اس طویل اپدیش پر مشتمل ہے جو انھوں نے پانڈوؤں کے سردار ارجن کو، جنگ پر ابھارنے اور لڑنے کی ترغیب دینے کے لیے دیا تھا۔

(د) ایک چیز یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان آیات کا خطاب اسلامی ریاست اور اس کی فوج سے ہے۔قرآن نے تمام مسلمانوں کو کھلی چھوٹ نہیں دے دی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں، غیر مسلموں کو قتل کردیں، بلکہ اسلامی ریاست سے دشمنی رکھنے والے غیر مسلموں سے جنگ کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف سربراہِ ریاست کو ہے۔ اسی کو طے کرنا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہیں؟ اور کی جائے تو کب اور کیسے؟ رعایا پر ہر حال میں اس کی اطاعت لازم ہے۔علامہ ابن قدامہؒ نے لکھا ہے:

أمر الجهاد موکول الی الامام واجتهاده، ویلزم الرعیّة طاعته فیما یراه من ذلک۔۳۳؎	جہاد کا معاملہ سربراہِ ریاست کے ذمے ہے۔وہی اس کا فیصلہ کرے گا اور رعایا پر اس کے فیصلے کو تسلیم کرنا لازم ہے۔

جن آیات میں 'کفار ومشرکین' سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اگر ان کا مطالعہ ان کے سیاق میں کیا جائے اور ان حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں وہ نازل ہوئی تھیں تو کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا، بلکہ پڑھنے والے پر ان کی معقولیت آشکارا ہوگی۔

حواشی ومراجع

۱؎ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، الهیئة المصریة العامة، ۱۹۸۷ئ، ۱۴/ ۱۲۶

۲؎ ایضاً

۳؎ ایضاً، ۵/ ۱۸۳۔علامہ قرطبی نے ان کا نام نوف الشامی بتایا ہے۔

۴؎ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جاره، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار